وطن عزیز کی آزادی کے لئے ہمارے رہنماؤں نے ہماری عوام نے کیا کیا ظلم وستم نہ سہہ، کیا کیا قربانیاں نہ دیں۔لیکن اس کے باوجود ہم ناکام ونامراد رہے۔ انگریزوں سے پوری طرح شکست کھا گئے۔اس کے باوجود بھی ہندوستانیوں کے حوصلے بلند ہی رہے۔

ابھی سموم نے مانی کہاں نسیم سے ہار
ابھی تو معرکۂ ہائے چمن کچھ اور بھی ہیں

تمام ہندوستان انگریزوں کی غلامی میں آ چکا تھا انگریز وقت اور حالات کو دیکھتے ہوئے یہی محسوس کر رہے تھے کہ اب ہم حاکم اور پورے ہندوستانی قوم محکوم ہو چکی ہے اور اب آزادی کی لڑائی لڑنے کا حوصلہ ہندوستانیوں میں باقی نہیں رہا۔

لیکن ہندوستانی یہ تو محسوس کر رہے تھے کہ انگریزوں سے ٹکر لینا آسان کام نہیں ہے کیونکہ جن وسائل کی ضرورت ہماری قوم کو تھی وہ ان کے پاس نہیں تھے۔اس کے علاوہ انگریز حاکموں کے مکار ذہن، چالبازیاں، دوغلی پولیسیاں ان شعبدہ بازی سے بھی بھولے بھالے ہندوستانی نابلید (ناواقف) تھے۔جس کی وجہ سے وہ فوراً انگریزوں کا شیکار ہو جاتے تھے اس کے علاوہ لڑاؤ اور پھوٹ ڈالو جیسی سازشیں اور حربوں کا بھی انگریزوں نے استعمال کیا۔

انگریزوں نے ۱۸۵۷ء کی آزادی کی پہلی لڑائی کو غدر کا نام دیا۔یہ غدر کیسے ہو گیا؟ اپنے ملک کو باہر کی قوموں کے شکنجے سے آزاد کرانا غداری یا غدر کیسے ہو گیا؟ ہندوستانی انگریز حکومت کے ظلم وستم اور ان کی بربریت سے عاجز آ چکے تھے۔اب یہ قوم بھی یعنی ہندوستانی قوم آزادی چاہتی تھی آزاد فضاء میں سانس لینا چاہتی تھی۔وہ اپنی حکومت اپنا راج چاہتی تھی اس کے حصول کیلئے اس نے انگریزوں کے خلاف آواز بلند کی اور انگریزوں نے اس آزادی کی لڑائی کو ''غدر'' کا نام دیا۔غدر کا نام دینا حقائق کا خون کرنے کے مترادف ہے۔

شریک محفل دار و رسن کچھ اور بھی ہیں
ستمگرو! ابھی اہل کفن کچھ اور بھی ہیں

اس طرح کے خیالات سے معمور ہندوستانیوں نے انگریزوں کے مظالم سہے، لیکن ان کے حوصلے پست نہیں ہوئے۔

ہندوستانیوں کی جان توڑ مقابلہ آرائی کو دیکھ کر مارک تھارن ہل نے کہا تھا کہ ''برطانوی حکومت کا نام ونشان چند ہفتوں ہی میں مٹ جانے میں تھوڑی کسر باقی رہ گئی تھی۔''

''دختر کش راجپوت کٹر برہمن متصب مسلمان اور عش پسند تو ندوالا من چلا مراٹھا سب ہی اس جہاد میں شامل ہو گئے تھے............گائے کا قاتل، اور گائے کا پجاری............سب ہی نے مل کر بغاوت کی۔''(4, مرتبہ پی سی جوشی, بغاوت عظیم انقلاب ۱۸۵۷ء ص ۱)

کچھ لوگ اسے جنگ آزادی تسلیم نہیں کرتے لیکن حقیقت میں یہ غلامی کے اندھیرے کو ختم کرنے والی پہلی شمع تھی اور یہ شمع شہیدوں کے خون سے روشن تھی۔اسی شمع نے ۱۹۴۷ء تک ہندوستان سے غلامی کے اندھیرے کا مکمل خاتمہ کر کے روشنی بکھیر دی۔اور آزادی کے عاشقوں کا یہ حال تھا کہ ''اکثر جہادی بھوکے مرتے تھے اور ان کے بدن پر کپڑے بھی نہ تھے۔مگر بغل میں تلوار یا کمر میں خنجر''(5, مولوی ذکاءاللہ ۱۹۰۴ء، تاریخ عروج انگلشیہ ہند۔ص ۵۳)

۱۸۵۷ء کی پہلی لڑائی کے اسباب پر سرسری نظر ڈالتے ہیں ۱۶۰۰ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی جو کہ تجارت کی غرض سے اس کا قیام عمل میں آیا تھا اس نے ہندوستانی تاجروں کا استحصال شروع کیا اس کے علاوہ کاریگروں سے بھی کم دام میں اشیاء خرید کر باہر زیادہ قیمت میں فروخت کرنے لگی۔صنعتی انقلاب کے بعد تو ہندوستانی دست کاروں کاریگروں کی حالت اور

بھی ابتر ہوتی گئی۔اور ہندوستان کی حالت تو صرف ''خام مال'' فراہم کرنے والی منڈی کی ہوکر رہ گئی۔جس کی وجہ سے ہندوستان کی معیشت بری طرح متاثر ہوئی۔اور صنعت کاروں پر اس کے منفی اثرات مرتب ہوئے۔

بقول لارڈ ولیم بینٹنگ ''دھاکہ کے لوگوں کی آبادی جو نفیس مکمل پیدا کرنے میں شہر آفاق تھی ۱۸۲۷ء اور ۱۸۳۷ء کے دوران ایک لاکھ پچاس ہزار سے گھٹ کر بیس ہزار رہ گئی، آرٹیکلز ان انڈیا کارل مارکس''

(6, مرتبہ پی سی جوشی، بغاوت عظیم انقلاب ۱۸۵۷ ص ۱۸)

ہندوستانیوں کا سب سے اہم پیشہ زراعت ہے لیکن انگریزوں نے ہندوستانی کسانوں پر لگان کا زبردست بوجھ ڈال کر کسانوں پر زبردست ظلم کیا جس کی وجہ سے کاشتکار طبقہ بری طرح متاثر ہوا جس کی وجہ سے انگریز حکومت کے خلاف نفرت کا جذبہ بھڑک اٹھا۔''ہندوستانیوں کا ضبط ٹوٹ چکا تھا ان کو ہتھکڑیاں اور بیڑیاں پہنائی گئیں غرض طرح طرح کے مظالم کئے گے۔''(7, عبدالماجاہد انصاری، ۲۰۱۲، جدوجہدِ آزادی میں اردو شاعری کا کردار، نیو والیس ص 205، ISSN.2231-3249)

یہ مقالہ چھے حصّوں پر مشتمل ہے، پہلا تاریخی نوعیت کا ہے جس میں ۱۸۵۷ء کے واقعات حالات اثرات وجوہات اور ان کے نتائج کو پیش کرتا ہے یہ موضوع ایک تاریخی موضوع ہے اس لئے اس دور کے حالات کو قلم بند کرنا ضروری ہے اور اگر اس حصّہ کو فراموش کر دیا جائے تو اگلے حصّوں کی تفصیل میں دشواری ہوسکتی ہے۔

ا:- تاریخی نوعیت

اس باب میں زیادہ واقعات دہلی اور اودھ کے ہیں کیونکہ یہ ایسے مقامات ہیں جو جنگ سے زیادہ متاثر ہوئے اور ان مقامات پر اس وقت کے اپنے دور کے اہم شعراء موجود تھے ایسا نہیں ہے کہ دوسرے مقامات پر ظلم وستم نہیں ہوا مگر دہلی اور اودھ ایسے مقامات ہیں جو زیادہ متاثر ہوے دہلی تو ہندوستان کا مرکز تب بھی تھی اور آج بھی ہے اس لئے ان مقامات پر بربادی زیادہ ہوئی۔''۱۸۵۷ء کے انقلاب میں تباہ و برباد ہونے سے پہلے دہلی نے اردو کے عظیم ترین شاعروں میں چند کو جنم دیا''۔(8, سید احتشام حسین، ۲۰۰۸ اردو ادب وسط انیسویں صدی تک، انتخابِ نثر اردو 2-259-7587-81-978.ISBN ص 80)

انگریزوں کے خلاف آزادی کی پہلی لڑائی کی ایک اور بڑی وجہ یہ بھی تھی کہ انگریزوں نے دیسی ریاستوں کا الحاق کرنا شروع کیا۔ولزلی اور ڈلہوزی یہ دونوں انگریز گورنر کٹر قسم کے جذبات رکھتے تھے ہندوستانیوں کی ان کے نظر میں کوئی اہمیت نہیں تھی ان دونوں کے دور میں دیسی ریاستوں کا بڑے پیمانے پر الحاق کیا گیا اور اس عمل سے بہت سے راجا اور نواب اپنی اپنی حکومتوں سے علیحدہ کر دئے گئے اور جب حکومتیں ہی نہیں رہی تو پھر ان کی اپنی فوج بھی بیروزگار ہوگئی۔ان لوگوں (فوجیوں) کی روزی روٹی کا مسئلہ بھی پیدا ہوگیا۔فوجیوں کی بے روزگاری کی وجہ سے ملک میں بے چینی کی لہر دوڑ گئی۔

اسکے علاوہ انگریزوں نے اوقافی جائیداروں کو بھی ضبط کرلیا جس کی وجہ سے مسلمان بھی زیادہ متاثر ہوئے۔انگریزوں نے مذہبی عقائد میں بھی مداخلت کی جو ہندوستانیوں کی زندگی میں کافی اہمیت کے حامل تھے۔مثلاً ستی کی رسم، بیواؤں کی دوسری شادی وغیرہ۔جن کی وجہ سے ہندوستانی بہت برہم ہوگئے۔اور انگریزوں کے خلاف بغاوت کے جذبہ کو تقویت ملی۔

کرسچن مذہب کی تبلیغ کا کام بھی انگریزوں نے کیا ہندوستانیوں کے غم اور غصے کی یہ بھی ایک اہم وجہ تھی۔اس کے علاوہ نئے نئے ٹیکس وغیرہ کا لگایا جانا یہ تمام حالات ہندوستانیوں کے لئے باعث تشویش ثابت ہوئے ''صنعتی انقلاب کے بعد تو تجارت کی نوعیت یکسر بدل گئی' ۱۸۰۰ میں بنا ہوا سوتی کپڑا دو ہزار چھ سو چھتیس گھنٹے بھیجا گیا تھا انتیس برس بعد اس کی تعداد چار سو تیس رہ گئی''. (9, از مولوی طفیل احمد، ۱۹۵۶ مسلمانوں کا روشن مستقبل ص 71)

اور ان میں انگریزوں کے خلاف غم وغصہ بھڑک اٹھا اور آخر میں اس نے بغاوت کی شکل اختیار کرلی۔اور آخر میں اس بغاوت کو کارتوسوں کے استعمال نے بھڑکا دیا۔

۹ مئی کو ہی ہندوستانیوں نے بغاوت کا علم بلند کیا۔

بہادر شاہ ظفر کو اپنا بادشاہ تسلیم کر کے ہندوؤں اور مسلمانوں نے ظفر کو تخت پر بٹھایا اور اتحاد کا مظاہرہ کرتے ہوئے جان توڑ آزادی کی لڑائی لڑی۔ بخت خاں کی وفاداری بھی قابل تحسین تھی اور مرزا الٰہی بخش کی غداری بھی قابل مذمت ندامت تھی۔ آخر کار ہڈسن نے بادشاہ کو گرفتار کر لیا اس ک علاوہ پوری دلی میں انگریزوں نے قتل وغارت گیری کا بازار گرم کر دیا تھا۔ بادشاہ بہادر شاہ ظفر کے خاندان کے ساتھ تو گویا یہ دوسری کربلا ہی تھی۔ شہزادوں کو سرعام پھانسیاں دی گئیں۔ کیا کیا ظلم نہ ڈھائے گئے۔

''الٰہی بخش کی نشان دہی سے تیس شہزادگان دہلی کو جن میں بادشاہ کے پوتے نواسے داماد تھے بیرون دہلی دروازہ قتل کیا اور ان کے سر کٹوا کر بادشاہ کے پاس بھیج دئے گئے۔(10, ظہیر دہلوی، ۱۹۰۵، داستان غدر۔ص ۱۲۴)

دی لندن ٹائمز کے نامہ نگار سر ڈبلیو رسل نے جنگ آزادی کے بارے میں اپنے خیالات اس طرح اظہار کیے ہیں۔

''یہاں نہ صرف غلاموں کی جنگ اور کسانوں کی بغاوت یکجا ہوگئی بلکہ اجنبی حکومت کا چولا اتار پھینکے ہندوستانی والیان ریاست کے کامل اقتدار کو بحال کرنے اور ملکی مذہب کا پورا غلبہ قائم کرنے کی غرض سے یہ ایک مذہب کی جنگ نسل کی جنگ انتقام کی جنگ اور ومی عزم کی جنگ تھی''۔(11, مائی ڈائری ان انڈیا ان دی ایر 59-1858 سر ڈبلیو۔ ایچ۔ رسل ص 55)

اردو شعراء نے گورے فرنگیوں کے خلاف اسی وقت لکھنا شروع کر دیا تھا جب انگریز ہندوستان میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے ذریعہ تجارت کے بہانے ہندوستان پر قبضہ کرنے کی کوشش کرنے لگے تھے۔ ابتداء میں یہ باتیں اشاتوں، کنایوں اور تمثیلیوں میں کہی گئی تھیں لیکن اب انگریز ہندوستان پر مسلط ہوتے اور چھاتے چلے گئے تو اردو شاعری نے بھی سیف قلم کی دھار صیقل کرنی شروع کر دی اور شعراء کی یہ بلند و بالا آوازیں تحریک آزادی کے زور پکڑنے کے ساتھ تیز ہوتی گئیں بلکہ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ اردو شاعروں نے ہی حریت، انقلاب، آزادی، سرفروشی، تحریک، مساوات، یکجہتی اور وطن دوستی کے حوالہ سے اپنی آوازیں سب سے زیادہ بلند کیں۔ یہ اردو ہی تھی جس نے آزادی کے متوالوں اور دیوانوں کو ایک پلیٹ فارم جمع کر دیا تھا۔ قومی ہم آہنگی، آپسی میل ملاپ اس دور کو ایک بہترین دور اس لئے کہا جاسکتا ہے کہ اس وقت ہندوستان میں سارے مذاہب کے لوگ شیر و شکر کی طرح آپس میں متحد تھے اور سب کا ایک ہی مشترکہ مقصد تھا، ہندوستان کی مکمل آزادی!

اس وقت اردو کے چھوٹے بڑے اور معروف اور غیر معروف شعراء نے عوام میں ایسا جوش و جذبہ بھر دیا تھا کہ ہر ہندوستانی اور محبّ وطن کے دل میں بس ایک ہی آرزو تھی کہ کس طرح انگریزوں کو اس ملک سے باہر جانے کے لئے مجبور کر دیا جائے۔ بے شمار شعراء نے قید و بند کی صعوبتیں اور پریشانیاں برداشت کیں لیکن کسی ایک وقت یا کسی ایک موقع پر بھی ان کے جذبہ حریت، جذبہ حب الوطنی میں کمی نہیں آئی۔ اس لئے ہم اسے کبھی فراموش نہیں کر سکتے۔

دراصل انگریز مسلمانوں کو ہی اپنا سب سے بڑا دشمن تصور کرتے تھے کیونکہ ۱۷۵۷ء میں پلاسی کے مقام پر سراج الدولہ اور انگریزوں کے بیچ لڑائی لڑی گئی۔ ہندوستان میں انگریزوں کی مخالفت سب سے پہلے مسلمانوں نے ہی کی تھی۔ سراج الدولہ کی شکست کے بعد سے ہی انگریزوں کے قدم ہندوستان میں مضبوط ہونا شروع ہوئے۔ اس کے بعد ٹیپو سلطان سے بھی انگریز خوف زدہ تھے ٹیپو سلطان کی موت کے بعد انگریزوں نے کہا کہ

''آج سے ہندوستان ہمارا ہے'' ان واقعات اور اس حقیقت کو دیکھتے ہوئے ہم یہ با آسانی اندازہ لگا سکتے ہیں کہ انگریزوں کو مسلمانوں سے کتنی دشمنی ہوسکتی ہے؟ ۱۸۵۷ء کی لڑائی میں انگریزوں نے مسلمانوں سے گن گن کر اپنا بدلہ لیا۔ دوسری ایک اور بات جو انگریزوں کو کھٹکی وہ یہ تھی کہ ایک مسلمان کو دوبارہ بادشاہ بنایا گیا لہٰذا وہ نہیں چاہتے تھے کہ مسلمانوں کی پھر سے حکومت قائم ہو۔ لہٰذا ہندوستانی تو ظلم کا نشانہ بنے ہی بنے تھے لیکن خاص طور پر مسلمانوں کو زیادہ ایزائش دیں گئی۔

مسلمانوں کے قتل کے بارے میں مولوی ذکا اللہ نے اپنی کتاب تاریخ عروج انگلشۂ ہند میں اس بات کا ذکر کیا کہ انگریز جہاں بھی مسلمان کو دیکھتے اسے اپنے ظلم کا

نشانہ بناتے۔ بوڑھے والدین کے سامنے جوان بیٹوں کو قتل کر دیتے۔

دہلی کی طرح اودھ کو بھی تاراج کیا گیا۔ برباد کیا گیا، اودھ کی تاریخ بھی انسانی خون سے ہی لکھی ہوئی ہے۔

روہیلوں کو شکست دینے کیلئے نواب نے انگریزوں سے مدد لی تھی وہی سے سمجھو کہ اودھ کی تباہی شروع ہوگئی تھی۔ آصف الدولہ پر دن بہ دن انگریزوں کا دباؤ بڑھتا گیا۔ انگریزوں نے اپنی فوج حکومتِ اودھ کہ خرچ پر یہاں رکھی۔ شہر بنارس کمپنی کے حوالے کرنے کا مطالبہ کیا اور سعادت علی کے تخت نشین ہونے کے بعد اپنی مرضی سے بہت ساری شرائط منظور کرالی۔

''اس نے ایک معاہدے پر دستخط کر دئے جس کی رو سے ایک کروڑ پینتس لاکھ سالانہ آمدنی کے اضلاع پر کمپنی کی حکومت تسلیم کرنا پڑی'' (12, خورشید مصطفیٰ، ۱۹۵۹، جنگ آزادی ۱۸۵۷ء ص ۲۹۴)

ظلم پھر ظلم ہے بڑھتا ہے تو مٹ جاتا ہے
خون پھر خون ہے ٹپکے گا تو جم جائے گا

ظلم اور بربریت کے اس ننگے ناچ نے ہندوستانیوں کے دلوں میں انگریزوں کے خلاف نفرت کا جذبہ بارود کی طرح بھر دیا تھا۔ غلامی کے احساس نے اس کو اور جلا بخشی۔ ہندوستانی غلامی کی زندگی سے موت کو ترجیح دینے لگے۔ مولانا احمد اللہ کی کوشش بھی اس سلسلے میں قابل تحسین ہیں۔

۳۰ مئی کو انڈیا چھاونی میں بغاوت ہوئی انگریزیوں نے انقلابیوں کو مچھی بھون کے سامنے پھانسیاں دیں جس کی وجہ سے عوام میں بے حد بے چینی پھیل گئی اور بغاوت کی آگ چاروں طرف پھیل گئی۔

کانپور میں انگریزوں کو شکست ہوئی جس کی وجہ سے اودھ میں خوشیاں منائی گئی اور واحد علی شاہ کے گیارہ سالہ بیٹے کو تخت پر بٹھایا گیا حکومت کی باگ دوڑ اس کی والدہ بیگم حضرت محل نے سنبھالی۔ انقلابیوں نے ریزیڈنسی کا محاصرہ کیا کئی حملے کئے جس کی وجہ سے انگریزوں کا باہر سے تعلق ہی ختم ہوگیا تھا لیکن بدقسمتی سے ہمارے اپنے ہی ہم وطنوں کی غداری کی وجہ سے (تیواری اور قنوجی) پھر سے انہوں نے باہر سے رابطہ قائم کرلیا لیکن اس رابطے کے باوجود ''ہیولاک'' لکھنؤ میں داخل نہ ہوسکا

''آزادی کے جذبے نے خواتین کو بھی میدان میں اترنے پر مجبور کر دیا اودھ میں کافی انتظامات اچھے کر لئے گئے تھے۔ بخت خاں عظیم اللہ خاں اور نانا صاحب جیسے انقلابی رہنما یہاں موجود تھے۔'' دیسی فوجیوں نے انگریز افسروں کے حکم کی تعمیل سے انکار کر دیا اور صاف صاف لفظوں میں کہہ دیا اب ہندوستان آزاد ہے ہم اپنے ملکی افسروں کے ماتحت ہیں اور یہاں واجد علی شاہ کی حکومت ہے'' ۔(13, خورشید مصطفیٰ، ۱۹۵۹، جنگ آزادی ۱۸۵۷ء ص ۳۰۰)

لیکن موخاں کی دھوکہ دہی اور نالائقی کی وجہ سے کامیابی نہ مل سکی۔ شیعہ سنی پھوٹ کی وجہ سے لکھنؤ پر انگریزوں کا قبضہ ہوگیا۔ جس کی وجہ سے انگریزوں کے حوصلے بلند ہوئے اور انہوں نے یہاں پر بھی دلی میں کیا گیا ظلم و جبر کا باب کھول دیا اور اسی سبق کو دہرایا۔ قتل وخون پھانسیاں، سخت دار لاشوں کے انبار غرض کوئی بھی حربہ ایسا نہیں تھا جسے انگریزوں نے استعمال نہ کیا ہو۔ رانی لکشمی بائی نے گوالیار فتح کرلیا تھا لیکن آخر کار وہ بھی انگریزوں کے ہاتھوں ماری گئی۔ اس شکست کے بعد انقلابیوں اور ہندوستانیوں کے حوصلے ٹوٹ گئے۔ ہندوستان پر انگریزوں کی گرفت کافی مضبوط ہوگئی تھی۔

ادب کی ایک تعریف یہ بھی ہے کہ ''ادیب زندگی کا آئینہ ہے'' جیسی زندگی ہوگی ویسا ہی عکس نظر آئے گا۔ بس اسی طرح سے ۱۸۵۷ء کے کرب ناک ماحول سے ادب اور

شاعر بھی کافی متاثر ہوئے۔

۲:- شہر آشوب

دوسرے باب کا مرکز شہر آشوب ہے اس باب میں شہر کے جو حالات پیش کئے گئے ہیں اور شہر کی بربادی بتائی گئی ہے اور جن حالات سے شعراء گذرے ہیں اس باب میں یہ تفصیلی تحریر ہے اس عہد کے شعراء نے اپنے دور کے مخصوص سیاسی وسماجی معاشی معاشرتی حالات کو جن مختلف اصنافِ سخن نے پیش کیا ہے ان میں شہر آشوب کو خصوصی اہمیت حاصل ہے کیونکہ جہاں تک موضوعاتی اعتبار سے شہر آشوب کی تخلیق کا سوال ہے وہ اس دور کے حالات سے پوری طرح ہم آہنگ ہے۔

اس عہد کے شعراء نے ان حالات کا جو اثر قبول کیا اس کو وقت کے سیاسی، سماجی، معاشی حالات کا ذکر مختلف اصناف سخن میں پیش کیا اور ان اصناف میں خاص کر شہر آشوب کو اہمیت حاصل رہی ہے۔

شہر آشوب کسے کہتے ہیں؟

(۱) کسی اجڑے ہوئے شہر کا ماتم یا ذکر۔(14 فیروز اللغات جلد دوم صفحہ ۸۰ فیروز الدین ۱۹۳۱

(۲) شہر اجڑنے کا منظوم بیان یا ماتم۔ (15, جامع اللغات مولوی محمد رفیع ۱۹۵۷

وہ مسلسل نظم جس میں شہر کے اجڑنے اور گردش آسمانی کے علاوہ زمانے کی ناقدری وغیرہ کا ذکر ہو وہ شہر آشوب کہلاتی ہے۔ فیروز الغات جلد دوم میں شہر آشوب کی تعریف اس طرح کی گئی۔

''کسی اجڑے ہوئے شہر کا ماتم یا ذکر''

عہد قدیم میں شہر کے برباد ہونے کا ذکر شہر کے سماجی، سیاسی اور معاشی خستہ حالت کا ذکر جو منظوم شکل میں پیش کیا گیا ہے سب سے پہلے ایک رنگؔ ناجیؔ اور حاتم وغیرہ کے یہاں نظر آتا ہے ان شعراء سے اور پیچھے جائیں تو ''بےنواؔ'' کے پاس سب سے قدیم نمونے شہر آشوب کے ملتے ہیں۔ بےنوا نے محمد شاہ کے دور کی ابتری کا ذکر کیا ہے۔ حاتم کے شہر آشوب خاص اہمیت رکھتے ہیں کیونکہ انہوں نے سیاسی، سماجی، معاشرتی حالات کو ہی پیش نہیں کیا بلکہ ان پر تنقیدی نظر بھی ڈالی ہے۔

حاتؔم کے بعد سوداؔ اور امیر قائمؔ کے دور میں شہر آشوب کو اور زیادہ نکھار ملا ترقی ملی

سوداؔ نے شاید دو شہر آشوب لکھے ایک کی شکل قصیدے کی ہے اور دوسرا مخمس کی شکل میں سودا کے شہر آشوب میں مختلف پیشہ وروں کی بدحالی کے ساتھ ساتھ حکمراں طبقے کی خودغرضیوں مفاد پرستیوں کا بھی ذکر ملتا ہے۔ نادر شاہ کے حملوں سے دہلی بری طرح متاثر ہوئی اور پھر اس کے علاوہ رہی سہی کسر مرہٹہ، جاٹ، سکھ اور افغانوں کے حملوں نے پوری کر دی۔ دلی جیسے شہر کے مٹ جانے برباد ہو جانے کا ماتم ہمارے شعرائے اکرام نے اپنی شاعری میں کیا۔ بقول میر تقی میرؔ ''دلی جو ایک شہر تھا عالم انتخاب'' اپنے اس محبوب شہر کے اجڑنے کا ماتم بہت سارے شعراء نے کیا ہے۔ اس عالم میں انتخاب شہر کو فلک نے لوٹ کر ویران کر دیا اس بات پر شعراء نے خون کے آنسوں بہائے ہیں۔ شہر آشوبوں میں دلی کی ویرانی اور بربادی کی تصویریں ملتی ہیں جس کو پڑھنے سے ہماری آنکھوں کے سامنے بھی ویسی ہی ویرانیاں آجاتی ہیں وہی منظر آتے ہیں جن کو شعراء نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔

آگے چل کر سیاسی حالات کی تبدیلی کی وجہ سے شہر آشوب کے موضوعات میں تنوع پیدا ہوتا گیا۔ اور تنقیدی زاویہ نگاہ زیادہ قوی ہوتا گیا۔ مثلاً شہر آشوب میں انگریز حکمرانوں پر بھی تنقید کی گئی ان کی سازشوں کو بھی شامل کیا گیا ساتھ ہی ساتھ ان سے نفرت کا بھی اظہار ہونے لگا۔ ان آشوبی حالات کا ذمہ دار انگریز کو ٹھہرایا جانے لگا۔

جہاں کہ نوبت و شہنای جھانجھ کی تھی صدا

فرنگیوں کا ہے اس جا پہ ٹم ٹم اب بجتا
اسی سے سمجھ رہا سلطنت کا کیا رتبا
ہو جب کہ محل سراوں میں گوروں کا بہرا

نہ شاہ ہے نہ وزیر اب فرنگی ہیں مختار۔اس دور میں اور ۱۸۵۷ء کے جن حالات سے شعراء گزرے ان حالات کو انہوں نے جوں کا توں شعری پیکر میں ڈال کر گویا ایک تاریخ ہی مرتب کر ڈالی۔ یہ شہر آشوب ایک تاریخی دستاویز کی سی اہمیت رکھتے ہیں۔

۱۸۵۷ء کی آزادی کی پہلی لڑائی کو جن شعراء نے انہی شاعری میں پیش کیا ان میں سے چند نمایاں شعراء اس طرح ہیں۔''دہلی کے ان مراثی میں مرزا داغؔ کے مرثیہ کو نمایاں حیثیت حاصل ہے اگر چہ شیفتہؔ اور آزردہؔ کے مرثیہ بھی زبان و بیان کے اعتبار سے خوب ہیں لیکن وہ دور دراز، سادگی اور جامعیت اور فنی خوبیاں داغؔ کے مرثیہ میں وہ دوسروں میں نہیں ہیں''۔(16, تفصیل حسیں خاں کوکب، ۱۹۵۴ فضانِ دہلی۔اکیڈمی پنجاب ص ۶۰,۵۹)

داغ دلہوی:۔ داغ کا پورا نام نواب مرزا خان تھا اور داغؔ تخلص''داغ نے اپنے شہر آشوب فغان دہلی میں ۱۸۵۷ء کی دردناک تصویر کو شاعرانہ انداز میں پیش کیا ہے۔دہلی پر گویا قیامت ٹوٹ پڑی تھی دہلی کے باشندے دہلی چھوڑ کر نکل رہے تھے تو داغ نے بھی دہلی کو خیر باد کہا اور رام پور منتقل ہو گئے۔دلی والوں کا حال ایک جگہ اس طرح بیان کیا ہے۔''1857ء میں غدر ہو گیا تو داغؔ بھی سرگرداں اور پریشان ہو گیا اور اپنے خاندان سمیت رام پور آ گئے۔''

(17, ڈاکٹر ابولیث صدیقی ۱۹۶۵، دہلی کا دبستان شاعری ص ۲۵۸)

اسی طرح اور ایک روایت ملتی ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کے داغ کی حالت ۱۸۵۷ء میں کیسے تھے۔''۱۸۵۷ء کے غدر میں کافی پریشان رہے۔کچھ سکون ہوا تو معہ اہل خاندان رام پور چلے آئے۔''(18، سید جلیل الدین، ۲۰۰۸، تاریخ ادب اردو، ص ۹۱)

چلیں ہیں دھوپ میں شکلیں جو ماہتاب تھیں
کھینچی ہیں کانٹوں پہ جو ہستیاں گلاب کی تھیں
جو زور آہوں کا لب پر تو شور نالوں کا
عجیب حال دیگر گوں ہے دلی والوں کا

اپنی غزلوں میں بھی داغ کے دلی اور اس کی بربادی کا ذکر کیا ہے۔

بہادر شاہ ظفر :۔ ۱۸۵۷ء کے سلسلے میں بہادر شاہ ظفر نے صرف ایک شہر آشوب لکھا ان کے یہاں اس موضوع پر غزلیں زیادہ ملتی ہیں دلی کی اپنی اور اپنی عوام کی بربادی کا ذمہ دار انہوں نے اپنے شہر آشوب میں آسمان کو ہی ٹھہرایا ہے۔ہندوستانیوں کو تو انگریزوں کے عذاب کا ان کی بربریت کا شکار تو ہونا ہی پڑا لیکن جو قیامت ظفر اور ظفر کے خاندان پر ٹوٹ پڑی وہ ایک ضعیف بادشاہ کے لئے کافی تکلیف کا باعث ثابت ہوئی بہادر شاہ ظفر کی شاعری حسرتوں سے بھری پڑی ہے ان کی غزلوں میں بھی یہ بات صاف نظر آتی ہے۔

گر گشتہ زمانہ ظفرؔ ایسا ہوا ہم سے
جو یار موافق تھے وہ پس یارِ مخالف

پئے (پڑھے) فاتحہ کوئی آئے کیوں کوئی چار پھول چڑھائے کیوں

کوئی آ کے شمع جلائے کیوں میں وہ بے کسی کا مزار ہوں

'' ظفؔر کے بیشتر اشعار کے پڑھنے سے سانحاتکی پوری تصویر ذہین کے اندر سماتی چلی جاتی ہے جو اس وقت کی بڑ اعظیم کی تاریخ کے ساتھ ساتھ ان کے حالات کو ظاہر کرتی ہے جو لال قلعہ، جنگِ آزادی اور اس کے بعد رنگون تک ظفؔر کے گرد وپیش موجود رہتے ہیں ۔محسوسات اور آپ بیتی سے مل کر یہ الفاظ ظفؔر پر بیتے ہوئے حوادث کو محو نہیں ہونے دیتے '' (19, خواجہ تہور حسین ۱۹۷۷ء بہادر شاہ ظفر شخصیت اور فن ص ۲۸)

'' اس کی حیثیت ایک قلعہ بند قیدی بادشاہ سے کچھ ہی زیادہ تھی '' (20, خواجہ تہور حسین ۱۹۷۷ء، ظفر شخصیت اور فن ص ۲۳)

سید ظہیر الدین ظہیر:۔ ظہیر نے اپنے شہر آشوب میں دلی کی خوبصورتی اور دلی والوں کی تعریفیں کی ہیں۔دلی کو جنت نشان عجائب مکان اہل بصیرت کی جانب اور اسی طرح خوش جمالوں نونہالوں کا اسے مرکز قرار دیا۔ان کی غزلیں بھی ۱۸۵۷ء سے متعلق بہترین تصور کی جاتی ہیں۔

ان شعراء کے علاوہ بھی بہت سارے شعراء ایسے ہیں جنھوں نے شہر آشوب کے ذریعے اپنی غزلوں کے ذریعے اور بھی متفرقات کا سہارا لے کر ۱۸۵۷ء کے حالات کی عکاسی اپنے اپنے فن کے ذریعے کی ہیں۔فہرست تو کافی طویل ہے لیکن ان میں سے چند کے نام اس طرح ہیں۔

قربان علی بیگ سالکؔ، محمد علی تشنہؔ، فضل حسین خان افسردہؔ، آغا جان بخشؔ، غلام دستگیر بیتؔن، عاقل ظہور محمد تقی سوزاں مرزا قربان علی کاملؔ وغیرہ۔ان کے علاوہ میر تقی میرؔ، دردؔ، مومنؔ، ذوقؔ، شاہ نصیرؔ، جرأتؔ، مصحفیؔ، رندؔ، اور اصباؔ

رندؔ اور اصباؔ کا انتقال ۱۸۵۷ء سے پہلے ہو چکا تھا لیکن ۱۸۵۷ء سے پہلے جو ہندوستان کے حالات بگڑ رہے تھے تمام ہندوستان میں انتشار ہی انتشار اور بے چینی کی کیفیت پیدا ہو چکی تھی ان دونوں شعراء نے ان حالات کی عکاسی اپنے شہر آشوب اور اپنی شاعری میں کی ہے۔

واجد علی شاہ اخترؔ کو معزول کر کے اودھ پر انگریزوں نے قبضہ کر لیا تھا انگریزوں نے یہاں کی عوام پر ظلم کے پہاڑ توڑ لئے اس مملکت کو اور یہاں کی عوام کو اپنے ظلم وستم سے برباد کر ڈالا لکھنؤ پر ویرانی چھائی۔

ان حالات کا ذکر شعراء نے اپنی شاعری میں بڑے ہی جذباتی انداز میں کیا ہے۔

غالبؔ:۔ محالب اُردو غزل کے بہت بڑے شاعر تسلیم کئے گئے۔وہ ۱۸۵۷ء کے ہنگاموں سے کافی متاثر ہوئے۔غالب ظفر کے دربار سے بھی وابستہ تھے۔انگریزوں نے ظلم وستم کی انتہا کر دی تھی۔جس کو دیکھ کر غالب نے ''شئے آقاؤں کی آتش انتقام'' کا نام دیا تھا۔اپنے ایک شعر میں وہ اس طرح کہتے ہیں۔

'' نئے فاتحین کشمیری دروازے کے سامنے کے راستے سے آگے بڑھے اور بازار کو جانے والے اور کوئی بھی سڑک پر ملا اُسے قتل کر ڈالا ۔'' (21, بحوالہ انقلاب ۱۸۵۷ء پی۔سی۔ جوشی بغاوتِ عظیم ص 207)

انھوں نے اپنے خط میں بھی اس کا اظہار کیا ہے ''غرض کہ اپنے مکان میں بیٹھا ہوں، دروازے سے باہر نہیں نکل سکتا۔سوار ہونا اور کہیں جانا تو بہت بڑی بات ہے۔رہا یہ کہ کوئی میرے پاس آوے۔شہر میں ہے کون جو آوے؟ گھر کے گھر بے چراغ پڑے ہیں۔مجرب سیاست پاتے جاتے ہیں۔'' (22, مرزا اسداللہ خان غالب، ۲۰۰۸، خطوط غالب, انتخاب نثر اردو 201 ص ISBN978-91-7587-259-2)

''غالب کے دور میں غزل کو نیا رنگ وآہنگ عطا ہوا''۔(23, پروفیسر عابد حسین محمد صادق ۲۰۱۳ اردو غزل کا طویل، صبر ،عکسِ ادب ۲۹ ص ISSN.2330-6519)

''غالب کی عمر ساٹھ سے اوپر ہو چکی تھی مگر تاریخ کے ان سیاہ لمحوں کو انھون نے اپنے ایک قلع میں محفوظ کر دیا۔جہاں غالبؔ انگریز حکومت کا شکوہ کرتے ہیں۔'' (24, عبدالماجد انصاری ۲۰۱۲، جدوجہدِ آزادی میں اردو شاعری کا کردار، نیو والیس ص 205، issn.2231-3249)

روز اس شہر میں حکم نیا ہوتا ہے
کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا ہوتا ہے

حالؔی :۔ الطاف حسین حالؔی کی شخصیت کئی اعتبار سے اہمیت کی حامل ہے۔بگڑتے ہوئے حالات کا حالؔی پر بھی اثر پڑا معاشی حالت بگڑ گئی۔صحت بگڑ گئی زریعہ معاشی کی فکر لاحق ہوئی۔ '' انکی ولادت 1839ء میں ہوئی 1857ء کے ہنگامہ کے وقت حالؔی ضلع حصار کے کلکٹری کے دفتر میں ملازم تھے اور ملازمت کو زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا کہ 1857ء کا ہنگامہ شروع ہوگیا۔وہ ملازمت چھوڑ کر اپنے آبائی مقام پانی پت چلے آئے۔''

(25, مجیب احمد،۱۹۶۹،مقدمہ دیوانِ حالی ۔ ص۵)

حالی کو دلی سے بے پناہ محبت تھی اس کے برباد ہوجانے کا غم انہیں بھی بہت تھا۔کہتے ہیں۔

تذکرہ دہلی مرحوم کا اے دوست نہ چھیڑ
نہ سناجائے گا ہم سے یہ فسانہ ہرگز

مندرجہ بالا شعر جس غزل سے لیا گیا ہے وہ غزل تیس اشعار پر مشتمل ہے۔

نواب مصطفیٰ خاں شیفتؔہ :-''شیفتؔہ بھی 1857ء کی لپیٹ میں آ گئے۔۔۔۔ٹھاکروں نے موقع دیکھ کر جہاں گیر آباد لوٹ لیا اور اس کے مکانات کو نذر آتش کر دیا۔ان میں ان کا قیمتی کتب خانہ بھی جل کر نذر آتش کر دیا۔ان میں ان کا قیمتی کتب خانہ بھی جل کر خاک ہوگیا ۔۔۔۔۔1857ء کا ہنگامہ شروہوگیا تو انگریزوں نے شیفتہ پر بھی مقدمہ چلایا اور سات سال کی سزا دی لیکن وہ اپیل میں بری کر دئے گئے'' (26, نواب مصطفیٰ خان شیفتہ،انتخاب کلام شیفتہ مقدمہ ص ۶۵)

۱۸۵۷ء کے ہنگامے سے شیفتہ راست متاثر ہوئے جہاں گرآباد کو لوٹ لیا گیا مکانات کو نذر آتش کر دیا گیا جس میں شفتؔہ کا کتب خانہ بھی جل گیا۔ان پر مقدمہ چلا سزا بھی ہوئی لیکن اپیل میں وہ بری ہوگئے۔ان حالات وواقعات نے شفتؔہ کو کافی متاثر کیا۔انہوں نے اپنی شاعری میں دہلی کی بربادی اور لوگوں کے قتل عام کا بڑے ہی موثر انداز میں ذکر کیا ہے۔

منیرشکوہ آبادی :۔ منیر نے جنگ آزادی میں براہ راست حصہ لیا۔لیکن انہوں نے کسی کا قتل نہیں کیا تھا البتہ ان سے انتقام لینے کیلئے ان پر فرضی قتل کا الزام لگا کر انڈوبان بھیج دیا گیا۔

کوٹھری تاریک پائی مشیل قبر
تنگ تر تھی حلقۂ زنجیر سے

ان کے علاوہ جن شعراء نے ۱۸۵۷ء کے حالات اور واقعات سے متاثر ہوکر اپنی شاعری میں ان حالات کو جگہ دی۔ان میں ظہیر دہلوی سالک،تفضّل حسین کوکب،کامل سید مہدی حسن،میر مہدی،میر لطیف علی،ثاقب،حافظ غلام دستگیر،عابد ہنر،ضمیر طالب،لالہ رام پرشاد ظاہؔر،رضوان شاطر،حکیم محمد مرزا شتاب خان،میر شاہ جہاں قمر،حکیم محمد احسن خاں،احقر عاصی،صابر عاقل عباس وغیرہ شعرائے کرام کے نام بہت نمایاں ہیں۔

۱۸۵۷ء کے تاریخی واقعات کو شعری قالب میں پیش کرنے کیلئے شعراء نے شہرآشوب غزل کے علاوہ دیگر اصناف کا بھی سہارا لیا جن میں قطعات،قصیدے وغیرہ بھی شامل ہیں۔

گھر سے بازار تک نکلتے ہوئے
زہرہ ہوتا ہے آب انسیاں کا
چوک جس کو کہے وہ مقتل ہے
گھر بنا ہے نمونہ زنداں کا

منیؔر کا شمار ان شعراء میں ہوتا ہے جنھوں نے اس جنگِ آزادی میں عملی طور پر حصہ لیا وہ نواب تجمل حسین خان کے انتقال کے بعد باندہ کے نواب کے یہاں گئے جہاں نہایت آرام و آسائش میں رہے لیکن ۱۸۵۷ء کے ہنگامے سے ان کی زندگی میں ایک انقلاب آ گیا انھیں انگریزوں کی چیرہ دستیوں کا شدید احساس تھا اور وہ اس کے خلاف صفِ آرا ہونا چاہتے تھے۔ اسی غرض سے انھوں نے باندہ کے نواب کو انگریزوں کے خلاف اُکسایا۔ نواب نے راج گڈھ کے قلعہ پر حملہ کر کے اسے فتح کر لیا ۔ڈاکٹر گوپی چند نارنگ اور زہرہ بیگم یاسمین کے خیال میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ نارنگ صحب کا خیال ہے کہ نواب نے راج گڈھ پر دھاوا بول دیا جبکہ زہرہ بیگم یاسمین نے لکھا ہے کہ ایک انگریز کے قتل کا انتقام لینے کے لیے ''وائٹ لاک'' نے باندہ پر حملہ کیا اس فتح پر منیؔر نے تہنیتی قطعہ لکھا ہے۔

فتح دی اپنی عنایت سے خدا نے آپ کو
سب عدو مقتول تیغ و بستہ زُنجیر ہیں

(27, زہرہ یاسمین, ۱۹۶۹ منیر شکوہ آبادی ص ۱۱۲)

شہر آشوب، غزل وغیرہ کے علاوہ قطعات مثنوی وغیرہ اصناف میں بھی شعراء نے ۱۸۵۷ء کے غضب ناک، خطرناک، دردناک، حالات کو پیش کیا۔ عابد، سودا، سالک، محمد حسین آزاد، حکیم تجمل رسول خاں، حکیم محمد خاں سوزاں، غلام علی مشتاق وغیرہ نے صنف قطعات کے ذریعے اپنے اپنے خیالات کو پیش کیا کہ کس طرح انگریزوں نے ہندوستانیوں کو ظلم کا نشانہ بنایا۔

اس کے علاوہ امان علی سحر، سید حیدر حسین سہیل، شاد پیز و میرؔ وغیرہ شعراء نے قصیدے لکھے اور خاص کر تشبیب کے حصے میں انگریزوں کے ظلم اور بربریت کو پیش کیا۔

واجد علی شاہ اختر آغا، بحوشرف، نواب محمد رجا خاں عاشقؔ، وغیرہ شعراء نے مثنوی کے ذریعے اس وقت کے آرام کا نقشہ پیش کیا۔

واحد علی شاہ اختر کی مثنوی حزن اختر'' بارہ سو اشعار پر مشتمل ہے۔ اس مثنوی کو اختر کی آپ بیتی کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ یہ مثنوی ۱۸۵۶ء کو مکمل ہوئی لیکن اس مثنوی سے ہمیں ۱۸۵۷ء کے اسباب اور حالات کو سمجھنے میں کافی مدد ملتی ہے۔

خواجہ اسد اللہ قلق، فدا علی عیش، اور امیر منیائی نے بھی اس وقت کے حالات مثنوی کی شکل میں پیش کئے ہیں۔

امیر منیائی پر ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کا راست اثر پڑا۔ اس ہنگامے میں ان کا کلام تلف ہو گیا تھا ان کی معاشی حالت بھی خراب ہو چکی تھی کیونکہ وہ واجد علی شاہ کے دربار سے وابسطہ تھے جب بادشاہ کو ہی معزول کر دیا گیا تو پھر ان کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ کس کس طرح سے انہیں حالات کا سامنا کرنا پڑا۔

غالب کے علاوہ دیگر شعراء نے بھی قطعات اور قصیدے اس سلسلے میں لکھے ہیں جن میں چند اہم شعراء کے نام اس طرح ہیں۔

داغ دہلوی، بہادر شاہ ظفر، سید ظہیر دہلوی، مفتی صدر الدین آزردہ، قربان علی بیگ سالک، محمد علی تشنہ، فضل حسین خاں افسردہ، آغا جان عشؔ، غلام دستگیر بین، عاقل، ظہور، محمد تقی سوزاں، مرزا قربان علی کامل۔

۳:- غزل :

غزل اردو شاعری کی ایک ہر دل عزیز سخن ہے۔غزل کے لفظی معنیٰ عورتوں سے بات کرنا،عورت کے حسن و جمال کی تعریف کرنا،نظم کی ایک ایسی صنف جس میں عشق ومحبت کا ذکر ہوتا ہے۔(28, الحاج مولوی فیروز الدین، فیروز اللغات،ص۹۱۳سِنا شاعت ۲۰۰۸)

ہر زمانے میں شعراء نے اس صنف سخن میں طبع آزمائی کی ہے۔اردو شاعری کا بہت بڑا سرمایہ غزل کی شکل میں محفوظ ہے۔غزل کے معنی ''سخن بایار گفتن'' کے ہیں۔اس طرح عشق و محبت غزل کے خمیر میں داخل ہے۔لیکن صرف محبت کے موضوعات ہی تک محدود نہیں۔اس کا دائرہ بہت وسیع ہے۔اس میں سماجی وسیاسی مسائل فلسفہ وتصوف اور انسانی زندگی کے مختلف پہلوؤں کی ترجمانی موجود ہے۔(29, ڈاکٹر فخر الاسلام اعظمیٰ ۲۰۰۸،شعورِ فن،ص ۷)

ظاہری ساخت کے اعتبار سے غزل کے پہلے شعر کے دونوں مصرعے ہم قافیہ ہوتے ہیں،اسے مطلع کہا جاتا ہے۔پہلے مطلع کے بعد آنے والے مطلع کو حسن مطلع کہتے ہیں۔آخری شعر میں شاعر اپنا تخلص پیش کرتا ہے۔غزل کے تمام مصرعے کسی ایک بحر میں ہوتے ہیں۔اسی طرح غزل کے شاعر کو قافیہ وردیف کی پابندی بھی کرنی ہوتی ہے۔یوں غزل غیر مردف بھی ہوسکتی ہے لیکن زیادہ تر شعراء نے قافیہ کے ساتھ ردیف کی بھی پابندی کی ہے۔غزل کا ہر شعر ایک مکمل اکائی ہوتا ہے۔اور کسی ایک مفہوم کا تاثر پیش کرتا ہے۔

غزل میں ۱۸۵۷ء کے زمانے کے حالات،مغلوں کے زوال،عوام کی زبوں حالی مصائب وآلام دہلی اور لکھنو کی تباہی کا ذکر ملتا ہے لیکن غزلوں میں پائے جانے والے حالات کا عکس نظموں،شہر آشوب اور مثنویوں کی طرح صاف واضح اور بیانیا انداز لیئے ہوئے نہیں ہے بلکہ غزل کے فنّی تقاضوں کو پیش رکھ کر کیا گیا ہے۔افرئیت اور ایمائیت کے نتیجہ میں ان عام سیاسی وسماجی حالات تک رسائی کیلئے دیدہ بینہ بھی ضروری ہے۔کبھی کبھی تو ایسا بھی ہوتا ہے کہ رمز وایما کے پردے کچھ اس طرح سے پڑے ہوئے ہوتے ہیں کہ علائم ورموز اور عام نگاہیں شعر کے اصلی محرکات اور سماجی حقیقتوں تک نہیں پہونچ پاتی۔'' کتنے ہی اشعار جو غزل کی رمزیت کا شکار ہوگئے اور آج اُن کے سیاسی محرکات کا پتہ چلانا ناممکن ہے ''(30, علی جواد زیدی ۱۸۳۳اُردو میں قومی شاعری کے سو سال ص ۲۰۱)

غزل نے ہر دور کے حالات کی ترجمانی کی ہے لیکن اپنے مخصوص انداز میں غزل کے آداب میں دیگر باتوں کے علاوہ اس بات کا بھی خیال رکھنا پڑتا ہے کہ یہاں تو مشاہدہ حق کی گفتگو کرنی ہو تو بادہ وساغر کا سہارا لینا ہی پڑتا ہے

ہر چند ہو شاہدۂ حق کی گفتگو
بنتی نہیں ہے بادہ ساغر کہے بغیر

اُردو غزل کا حسن قائم رکھنے اُس میں معنوی جہتوں کو اُبھارنے کے لیئے ایوان غزل میں یہی دستور رہا ہے۔یہی وجہ ہے کہ ۱۸۵۷ء سے متعلق جو شعری سرمایہ غزل کی صورت میں دستیاب ہوتا ہے،اُس میں استعمال ہونے والے علائم اور اشعاروں کا تجزیاتی مطالعہ کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ درحقیقت چمن،آشیانہ،قفس اور صیاد کہ کر وطن،گھر،اسیری اور ظالم اور انگریز مراد لیے گئے ہیں۔غزل کے مزاج سے واقفیت رکھنے والا کون سا قاری ہوگا جو اس دور کی غزل میں ''بہار'' اور ''خزاں'' کو خوش حالی وآزادی اور انتشاری وغلامی کے دور پر محمول نہیں کرے گا۔

اُردو غزلوں میں سیاسی رنگ قدیم عہد ے ہی نظر آتا ہے مظہر جانِ کے عہد میں شمالی ہند کے جو مخصوص سیاسی حالات تھے اُن کے پیشِ نظر اُردو شعراء کے پاس سیاسی شعور صاف طور پر دکھائی دیتا ہے اور غزلوں میں سیاسی حالات کی واضح جھلک دیکھی جاسکتی ہے مسلمانوں کی بے بسی اور محتاجی کے پیش نظر مندرجہ ذیل شعر بھرپور سیاسی رنگ لئے ہوئے نظر آتا ہے۔

یہ حسرت رہ گئی کس کس مزے سے زندگی کرتے

اگر ہوتا چمن میں اپنا، گُل اپنا، باغباں اپنا

(31, علی جواد زیدی ۱۸۳۳ اُردو میں قومی شاعری کے سو سال ص ۶۵)

اس باب میں جن شعراء کے کلام کو درج کیا گیا ہے وہ مندرجہ ذیل ہیں۔

غالبؔ، بہادر شاہ ظفرؔ، داگ دہلوی، الطاف حسین حالی، نواب محمد مصطفٰے خان شفتہ، ظہیر دہلوی، منیر شکوہ آبادی، سالک، فضل حسین کوکب، کامل، سید مہدی حسن مہدی، میر مہدی مجروح، میر لطف علی انامی، ثاقب، حافظ غلام دستگیر بین، عابد، مہنر، ضمیر، طالب، لالہ رام پرشاد ظاہر، رضوان، شاطر، حکیم محمد مرزا خاں اکرام، شتاب خاں سپہر، میر شاہ جہاں احمد، حمر، حکیم محمد احسن خاں احسن، احقر، عاصی، صابر، عاقل، عباس

۴: متفرقات:

قطعہ میں غزل کی بہ نسبت واقعات اور کوائف کو تفصیلی طور پر پیش کرنے کی زیادہ گنجائش ہے۔ اس میں شاعر اپنے احساسات، جزبات اور خیالات کو مربوط انداز میں پیش کر سکتا ہے۔ اس میں نظم کی طرح خیال کا باضابطہ ارتقاء ملتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ۱۸۵۷ء کے واقعات کو جن شعری پنتیوں میں پیش کیا گیا ہے ان میں قطعہ کو بھی خاص اہمیت حاصل ہے۔ ان میں ملکی حالات و کوائف اور مناظر کی ہو بہو مرقع کشی کی گئی ہے۔ مکمل اظہار خیال کی گنجائش کی وجہ سے اس میں یہ وصف پیدا ہو سکا، قطعات کو اس دور سے قبل زیادہ در خور اعتنا نہیں سمجھا گیا۔ اس سے پہلے جو معمولی سرمایہ نظر آتا وہ بڑی حد تک حسن و عشق کے کسی پہلو کا احاطہ کئے ہوئے ہے۔ بعض جگہ اخلاقی موضوعات بھی ملتے ہیں۔ وقت کے ساتھ ساتھ یہ صنف سخن اپنے دور کے حالات سے ہم آہنگ ہوتی چلی گئی۔ بے روزگاری کی شکایت، بے ثباتی اور ناپائیداری جیسے موضوعات بھی قطعہ کے موضوعاتی دائرے میں شامل ہوتے چلے گئے۔ حاتمؔ کے بعد سوداؔ کے قطعات میں ملکی حالات کی عکاسی کی گئی ہے۔ ٹیپو سلطان کے دور کے شعراء سید قاضی عالم حسین علی کرمانی وغیرہ کے دور کے قطعات میں انگریزوں (فرنگیوں) کا ذکر ملتا ہے۔

فرنگ و زنگ تری تیغ سے کیوں کر نہ لرزاں ہو

کہ جس کے خوف دم سے برق ہر دم پا بہ داماں ہو

قطعہ کے فنی وصف سے استفادہ کرتے ہوئے شعراء نے ۱۸۵۷ء کے واقعات اور حالات کی تصویر کشی مفصل انداز میں کی ہے۔ اور اس میں اس دور کے ہو بہو مرقعے محفوظ کر دیے ہیں۔

متفرقات میں جن شعراء کا کلام درج ہے وہ مندرجہ ذیل ہیں۔

اسد اللہ خاں غالب، سالک، حکیم تجمل رسول خاں، حکیم محمد خاں سوزاں، غلام علی مشتاق، امان علی دحر، سید حیدر حسین سہیل، شاد پیر و میر، واجد علی شاہ اختر، آغا ہجو شرف، نواب محمد رضاں خاں عاشق، خواجہ اسد اللہ قلق، فدا علی عش، امیر مینائی

۵: مابعد شعراء :

۱۸۵۷ء کی شکست کے بعد ہندوستانیوں میں بے چینی پھیل چکی تھی۔ غیر ملکی سامراجی طاقت کے شکنجے میں جکڑے جانے کے شدید احساس نے انہیں بے چین کر کے رکھ دیا تھا۔ جس کی وجہ سے آزادی کی خواہش نے شدت سے دل میں گھر کرنا شروع کر دیا تھا۔ جذبۂ حب الوطنی اور جذبۂ حریت تیزی سے پروان چڑھ رہا تھا شاعروں نے بھی اس جذبے سے سرشار ہو کر اپنے فن کو بھی اور نکھارا اور ساتھ ہی ساتھ لوگوں کے اس جذبے کی عکاسی بھی کی۔

جس کی وجہ سے اس دور کی وطنی شاعری قومی و ملی شاعری اور اصلاحی شاعری اردو شاعری کا خاص حصہ بن گئی۔ آزادی کی جدوجہد کی تاریک کو اردو شاعری نے اپنے اندر

محفوظ کرلیا ہے۔لہٰذا ۱۸۵۷ء سے لے کر ۱۹۴۷ء تک کے آزادی کے سفر کی روداداردو شاعری میں ملتی ہے۔تقریباً سوسال کے عرصے پر آزادی کی لڑائی کا دائرہ کافی وسیع ہے مگر ’۱۸۵۷ء کی جنگ کے بعداردو ادب میں بہت سی نئی اصناف متعارف ہوئیں مثلاً: ناول،افسانہ،کہانیاں،مضامین،نئی نظم،روایتی نظم،آزادنظم،نظم مّرا وغیرہ،‘‘(32, سراج احمدانصاری،نوآبادیاتی ادب ارع پس نوآبادیاتی رجحان،اردودنیاص۵۶,issn.8849-0639)

انقلابی شاعری کے سلسلے میں جوش کا نام سرفہرست آتا ہے۔جنھوں نے بہت ہی جوشیلی نظمیں لکھی۔ایسٹ انڈیا کے فرزندوں کے نام اور شکست زنداں کا خواب انگریزوں کے ظلم اور بربریت سے وہ عاجز تھے انگریزوں کو سوداگروں کہہ کر مخاطب کرتے تھے۔

ساغرنظامی :۔ ساغرنظامی نے نظم مشعلِ آزادی لکھی جو تقریباً تین سوصفحات پر مشتمل ہے۔انہوں نے اپنی نظم میں حضرت شاہ ولی اللہ،سراج الدولہ،شاہ عبدالعزیز،سید احمد شہیدؒ،حیدرعلی اور ٹیپوسلطان کی وطن دوستی اور جذبۂ آزادی کا اظہار شاعرانہ انداز میں پیش کیا۔اس کے علاوہ بہادرشاہ ظفر تاتیاٹوپے،جھانسی کی رانی،جنرل بخت خاں،حضرت زینت محل،عظیم اللہ خاں اور نانا صاحب پیشوا وغیرہ کے کارناموں پر بھی فن کارانہ روشنی ڈالی ہے۔یہ نظم رزمیہ شاعری کی ایک اہم تخلیق بھی سمجھی جاسکتی ہے۔

غلام ربانی تاباںؔ :۔ تاباں نے ایک آزادنظم ’’انتقام‘‘ لکھی جس میں ہندوستانیوں پر انگریزوں نے جو ظلم کے پہاڑ توڑے ہیں اس کو بڑے ہی موثر انداز میں پیش کیا۔

(33, غلام ربانی تاباں،سازلرزاں تاباں، ص۱۳۷)

جگناتھ آزاد :۔’’ سبھاش چندر بوس، بہادرشاہ ظفر کے مزار پر ‘‘ جگناتھ آزادؔ کی وہ نظم ہے جس میں اُنھوں نے سبھاش چندر بوس کے مخصوص حالات میں ہندوستان سے باہر رنگون جانے اور بہادرشاہ ظفر کے مزار پر پہونچ کر انگریزوں کے ظلم وستم اور ہندوستانیوں میں پائے جانے والے جذبۂ آزادی کا ذکر کیا ہے۔

نظم میں چند اشعار ایسے بھی آتے ہیں جہاں یہ رہ نما اپنی ماضی کی تاریخ کو دُہرا کر برطانوی سامراج کے زور وستم کا تذکرہ کرتا ہے اور انتقام لینے کی بات کرتا ہے ۔

میرے دل کو یاد ہے اب تک وہ ستاون کی جنگ
جس کے بعد اس سرزمیں پر چھاگئے اہلِ فرنگ

(34, بیکراں آزاد،۱۸۹۵، ص110.117)

آنند نارائن ملا :۔ نظم زمین وطن لکھ کر ملا نے اپنے حب الوطنی کے جذبات کی عکاسی کی ہے۔اس نظم میں انہوں نے یہ بتاتا ہے کہ انگریزوں نے ہندوستان کی دولت چھین کر یہاں کی صنعتوں کو برباد کر کے اور ہندوستانی کسانوں کو کنگال بنا کر اپنے ملک کو دولت مند بنایا ہے۔

مُلّا کی نظم ’’زمینِ وطن‘‘ دراصل حب الوطنی کے جذبہ کے تحت تخلیق ہوی ہے۔اورزمانی اعتبار سے بہت طویل زمانہ کو محیط ہے۔ بھارت کی تہذیبی وتمدنی قدامت اور اس کی امتیازی خصوصیات کا ذکر کرنے کے بعد محکومی کی حالتِ زار بیان کی گئی ہے۔شاعر کہتا ہے کہ ہندوستانیوں کی دولت وحشمت چھین کر یہاں کی صنعتوں کو دفن کر کے، کسانوں کو کنگال بنا کر انگریزوں نے اپنے ملک کو دولت مند بنایا ہے ۔

مٹا کر تیری بازار یاں
بنیں اہلِ یوروپ کی زرداریاں
تیرے خوں کی سینچی ہوئی کیاریاں

یہ مغرب کے سب لہلہاتے چمن

(35, انتخاب کلام آنند نرائن مُلا ص ۶۶.۵۸)

راہی معصوم رضا :۔ رضا نے ایک نظم جھانسی کی رانی لکھی جس میں انہوں نے لکشمی بائی کے کردار خاص کر اس کی بہادری جرات اور انصاف پسندی کو نظم کے قالب میں ڈھال کر پیش کیا۔

نظم ''جھانسی کی رانی'' ۱۸۵۷ء کی جانباز خاتون رہنما 'لکشمی بائی' سے متعلق ہے جس میں اس لڑائی کی تفصیل بھی درج ہے۔اس میں لکشمی بائی کے کردار کے چند پہلو بالخصوص جراءت و بہادری اور انصاف پسندی کو تاریخی واقعات کی روشنی میں پیش کیا گیا ہے۔انگریزوں اور جھانسی کی رانی کے درمیان ہونے والی لڑائی ۱۸۵۷ء کی لڑائیوں میں سے ایک ہے۔انگریزوں کے خلاف کمر بستہ ہونے کی وجہ ڈلہوزی کی الحاقی پالیسی رہی۔جھانسی کو انگریزی سامراج میں ملحق کرنے کے لیے انگریزوں نے راجا گنگا دھر راؤ کے متبنیٰ کو جانشین تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔جس کے نتیجہ میں جھانسی کے عوام بھی برہم ہو گئے، اور انقلابی صفوں میں کھڑے ہو گئے۔نظم کا آغاز اس طرح ہوتا ہے۔

ناگہاں چپ ہوئے سب آ گئیں باہر رانی
فوج تھی ایک صدف اس میں تھی ایک گوہر رانی
مطلع جہد پہ تھیں غیرت اختر رانی
عزم پیکار میں مردوں کے برابر رانی

(36, جاں نثار اختر ۱۹۷۴ ہمارا ہندوستان ص ۲۲۵)

جگت موہن رواں :۔ رواں کی نظم ہند مظلوم پڑھ کر ۱۸۵۷ء کے واقعات ہماری نظروں کے سامنے آجاتے ہیں لوگوں کی بے بسی، گھروں کا منہدم کرنا اور قتل و غارت گیری کا نقشہ انہوں نے لفظوں کے ذریعے پیش کیا ہے۔

رواں کی نظم 'ہندِ مظلوم' ہندوستانیوں کے حُریت کے مچلتے ہوئے جذبہ کا شعری اظہار ہے۔جس میں بعض جگہ شاعر اپنے ماضی پر نظر ڈالتا ہے اور جب ہم یہ شعر پڑھتے ہیں تو خاص طور پر ۱۸۵۷ء کے واقعات ہماری نظروں کے سامنے اُبھرنے لگتے ہیں۔لوگوں کی بے کسی، گھروں کے انہدام، قتل و خون وغیرہ سے متعلق مندرجہ ذیل اشعار مرقع نگاری کا شاہکار نمونہ ہیں۔

چند مظلوم زن و مرد کچھ اُجڑے ہوئے گھر
سرخیاں ہیں یہ مری قوم کے افسانوں کی
چھینٹیں کچھ خون کی دیواروں پہ کچھ کاسہ، سر
یادگاریں ابھی محفوظ ہیں دیوانوں کی

(37 علی جواد زیدی، ۱۹۸۲, اردو میں قومی شاعری کے سو سال ص ۳۳۹)

عرش ملیسانی :۔ عرش ملیسانی نے ۱۸۵۷ء کے واقعات خاص کر بہادر شاہ ظفر'' کو اپنی نظم کا موضوع بنایا۔اس نظم میں ظفر کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی

اور ساتھ ہی ساتھ ان کی شاعرانہ صلاحیت کا بھی ذکر کیا۔

غالبؔ و ذوقؔ کے افکار کا وہ قدر شناس
جس کو تھا مومنؔ و آرزوؔ کی عظمت کا پاس

تلکوک چند محروم:۔

محروم نے اپنی شاعری کے ذریعے ۱۸۵۷ء کے شہیدوں کو خراج عقیدت پیش کیا ہے ان کی نظم ''پھول برساؤ شہیدان وطن کی خاک پر'' ایک بہترین نظم تصور کی جاتی ہے۔

سلام مچھلی شہری :۔ سلام مچھلی شہری نے اپنی نظم سونے کا درخت لکھ کر یہ بتلایا ہے کہ ہندوستان سونے کی درخت کی مانند تھا۔ کئی راہ گیروں کو فیض پہنچا چکا لیکن انگریزوں نے اس درخت پر قبضہ کرلیا ہے۔ اور وہ سونے کا درخت بھی پت جھڑ کی زد میں آ گیا۔

(38, علی جواد زیدی، ۱۹۸۲ اردو میں قومی شاعری کے سو سال، ص ۴۳۰)

اعجاز صدیقی :۔ اعجاز صدیقی نے ۱۸۵۷ء کی عید عنوان سے کافی بہترین نظم لکھی جس میں انہوں نے اپنے جذبات کی عکاسی کی ہے۔ ۱۸۵۷ء میں بھی عید آئی تھی لیکن وہ اس عید کو کربلا تسلیم کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ ہماری جنگ آزادی نظم بھی انہوں نے لکھی۔

'' 1857 کی عید ''

شاعر عید کے موقع پر ایک سو سال پرانی عید کو یاد کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اس وقت جو عید آئی تھی وہ صرف نام کو عید تھی حقیقت میں عید اور محرم میں کوئی فرق نہ تھا کیونکہ ''سلسلہ داروگیر'' ''قید و بند'' دار و رسن ایسی چیزیں تھی جنھوں نے اسے اشک فشاں اور خون چکا بنا دیا تھا۔ مکانوں اور مکینوں کی کارجی حالت اور داخلی کوائف کو بھی پیش کیا گیا ہے۔

قید و بند ایک طرف دار و رسن ایک طرف
دل تھے مجروح تو ڈوبی ہوئی حسرت میں نظر

(39, اعجاز صدیقی ۱۹۷۹ کرب خود کلامی ص ۴۰.۴۱)

جمیل مظہری کی بھی ایک نظم ''بھارت ماتا'' ہے جس میں انہوں نے یہاں کی ملی جلی تہذیب حب الوطنی اور مناظر فطرت کی عکاسی کی ہے۔

محمود جالندھری نے نظم ''لکشمی بائی'' لکھ کر اس کی بہادری کی تعریف بھی کی ہے اور ہندوستانیوں کی حالت زار کا بھی ذکر کیا ہے۔

اسی طرح رفعت سروش، وقار واثقی، شمیم کرہانی، اقبال احمد سہیل، کمال احمد صدیقی، غلام احمد فرقت، یحییٰ اعظمی اور احمق پھپھوندی، وغیرہ شعراء نے بھی ۱۸۵۷ء کے حالات کو اپنے کلام کے ذریعے آنے والی نسلوں تک پہنچایا اور ساتھ ہی ساتھ ۱۸۵۷ء کی آزادی کی پہلی لڑائی میں اپنی جانوں کی قربانی دینے والے سورماؤں اور جاں بازوں کو خراج عقیدت بھی پیش کیا۔

پہلی جنگ آزادی سے متعلق شعراء کو دو حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔

1) معاصر شعراء 2) شعرائے مابعد

1) معاصر شعراء :۔ جن شعراء کا اس آزادی کی لڑائی سے براہ راست سابقہ رہا۔ وہ خود بھی ان نامساعد حالات کا شکار ہوئے ایسے شعراء کیلئے یہ ایک سلگتا ہوا موضوع بنا ہوا ہے۔

بعض شعراء ایسے بھی تھے جو براہ راست ان حالات سے متاثر تو نہ ہوئے لیکن ان خطرناک حالات سے وہ محفوظ نہیں رہ سکے ان شعراء نے بھی شعری سانچوں میں ڈھال کر اپنے دل و دماغ میں اٹھتے ہوئے طوفان کی عکاسی کی۔

2) شعرائے مابعد :۔ ۱۸۵۷ء کی لڑائی ایک تاریک بن گئی۔ اگر چہ کہ ہندوستانیوں کو اس پہلی لڑائی میں شکست ہوی ایسی شکست نے ان کے اندر آزادی کے جذبوں کو اور ابھارنے کی کوشش کی اور یہ کوشش ۱۹۴۷ء کو پائے تکمیل کو پہنچی۔

۱۸۵۷ء کی لڑائی میں شہید ہونے والے سورماؤں کے کارناموں کو ہمارے شعراء نے نوجوان نسل کے سامنے اپنی شاعری کے ذریعے پیش کیا جس کی وجہ سے آزادی کے متوالے نئی توانائی قوت اور تحریک پاتے رہے ان مجاہدوں کو علامت کے طور پر اردو شعراء نے پیش کر کے انہیں خراج عقیدت اور خراج تحسین پیش کیا جسے بیگم حضرت محل تنظیمی صلاحیتوں کی علامت بن گئیں۔ اسی طرح جھانسی کی رانی عورت کے وقار کی علامت تسلیم کی گئی۔

۱۸۵۷ء سے متعلق موضوعات کو جوش جگناتھ آزاد، ساغر نظامی، اعجاز صدیقی اور راہی معصوم رضا وغیرہ نے بہت ہی فن کارانہ انداز میں پیش کیا۔

ایسا محسوس ہوتا ہے کہ پہلی جنگ آزادی کی لڑائی ہمارے شعراء کے اجتماعی تصور کا جزو بن گئی۔

اس درد کی شاعری نے اُردو شاعری کے دامن کو کافی وسیع کر دیا اور ساتھ ہی ساتھ کئی زاویوں سے اردو شاعری کی اہمیت میں اضافے کئے۔

قومی وملی شاعری کو کافی عروج حاصل ہوا اردو شاعری کے خذانے میں بیش بہا اضافے ہوئے اور نہ صرف اضافے کئے گئے بلکہ شعری وادبی محاسن سے بھی اردو شاعری مملو نظر آئی ہے۔ اس دور کی شاعری میں کچھ خاص خصوصیات ملتی ہیں جو ایسے قدیم ادب سے ممتاز کر دیتی ہے۔ اور یہیں سے جدید ادب کا بھی نقطۂ آغاز ہوتا ہے۔

۱۸۵۷ء سے پہلے ادب میں سماجی زندگی کو اتنے قریب سے نہیں دیکھا گیا تھا۔ اردو شاعری کا زیادہ تر حصہ خیال آرائی اور مضمون آفرینی تک ہی محدود تھا۔ اسی کے علاوہ ادب درباروں تک ہی محدود تھا۔ اس واقعہ کے بعد ادب بھی درباروں سے نکل کر اور جاگیر دارانہ نظام کی زنجیروں کو توڑ کر عوامی زندگی میں گھل مل گیا۔ شعراء نے اپنے جذبات و احساسات کی ترجمانی ادب کے ذریعے اور اس میں عوامی زندگی، عوامی مسائل کو موضوع بنایا۔ غزل میں داخلیت کو اولیت دی گئی۔

۱۸۵۷ء کے حالات کو موضوع بنانے والے شعراء عصری زندگی کی بہترین ترجمانی کی نہ صرف ترجمانی کی بلکہ حقیقت نگاری کو بھی اولیت دی۔

ترقی پسند ادب میں عزیز احمد کہتے ہیں کہ اس دور کے شعراء نے بہت ہی صاف اور سیدھے انداز میں اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے ان کا یہ انداز موضوع سے برابر میل کھاتا ہوا ہے۔ انہوں نے یہ تسلیم کیا ہے کہ فن کار زندگی سے جتنا قریب ہوگا اتنا ہی بڑا حقیقت نگار بھی ثابت ہوگا۔

غزل چونکہ داخلی جذبات واحساسات کی ترجمانی کرتی ہے لیکن خارجی حالات کا بھی ذکر اس عہد کی غزل میں ملتا ہے۔ غزل پر یہ اعتراض کہ اس میں صرف حسن وعشق کے موضوعات ہی پیش کئے جاسکتے ہیں اس دور کی غزل نے اس اعتراض کو غلط ثابت کر دکھایا۔ اس کے علاوہ غزل میں مسلسل ایک خیال کو بھی ہم مربوط طریقے سے پیش کر سکتے ہیں گویا غزل پر ایک اور اعتراض کہ ہر شعر میں الگ الگ خیال ہی پیش کیا جاسکتا ہے غلط ثابت ہوتا ہے۔

اگر شاعر کے جذبات میں شدت ہو اور وہ اپنے ذاتی تجربات کو احساس کی بھٹی میں پگھلا کر تخلیقی عمل سے گزر رہا ہے تو ایک زیریں لہر کی طرح موڑ کر یکسانیت تمام اشعار کو مالا کے موتی کی طرح ایک دوسرے سے جوڑ دیتی ہے۔ لہٰذا یہ بات باطل قرار دی جاتی ہے کہ ''غزل نیم وحشی نصف بخش ہے اور اس میں خیالات کا انتشار ملتا ہے''۔

قدیم دور میں دوغزلہ، سہ غزلہ کی شکل میں اور کہیں کہیں مسلسل غزل کا انداز بھی ملتا ہے، لیکن مسلسل غزل کی جو شکل ۱۸۵۷ء کے شعری سرمائے میں ملتی ہے وہ ایک مضبوط اور مستحکم ادبی روایت کی حیثیت رکھتی ہے۔

اردو ادب کی تاریک میں غزلیں، شہر آشوب نظمیں اجتماعی المیہ نگاری کی بہت بڑی مثال ہے جس میں ہزاروں لاکھوں مصیبت کے ماروں کا درد سمیٹ آیا ہے۔

اگر ہمیں ۱۸۵۷ء کی تاریخ کا مطالعہ کرنا ہو تو اس وقت کے شعری سرمائے کا مطالعہ بے حد مفید ہوگا اس میں سیاسی سماجی، تہذیبی مُرقع موجود ہیں اور ساتھ ہی ساتھ جذباتی موقعوں کو بھی پیش کیا گیا ہے۔

اس دور کی شاعری میں داخلی اور خارجی کیفیات کی بہترین ترجمانی کی گئی ہے۔ زندگی کی نارسایوں، تلخیوں اور محرومیوں نے سوگواریت اور حزنیہ رنگ اس دور کی شاعری میں بھر دیا ہے اس سوز و گداز کو دیکھ کر ان کی تخلیقات کو مرثیہ کا بھی نام دیا گیا ہے۔

۱۸۵۷ء کے ادب نے یہ بات ثابت کر دی ہے کہ ادب اور زندگی میں بہت گہرا رشتہ ہے۔ کسی بھی صورت میں فن کار اپنے ماحول سے علیحدہ نہیں رہ سکتا اور نہ ہی عصری مسائل سے چشم پوشی کر سکتا ہے۔ اس کے علاوہ ۱۸۵۷ء سے متعلق جو شہر آشوب لکھے گئے اس میں مختلف پیشہ وروں کا ذکر ملتا ہے۔ اور ان کے پیشے کے لحاظ سے لفظوں کا استعمال کیا گیا ہے۔ یہ لفظی ذخیرہ اردو کی کسی دوسری اصناف میں ملنا مشکل ہے غرض یہ کہ ہماری تہذیبی زندگی سے تعلق رکھنے والے سینکڑوں الفاظ استعمال کئے گئے ہیں جس کی وجہ سے شعری لفظیات میں بیش بہا اضافہ ہوا ہے۔ جس کی وجہ سے کلام میں وسعت اور گہرائی پیدا ہوگئی ہے۔

لفظی ترکیبوں کا بھی اس شاعری سے خاص تعلق ہے ۱۸۵۷ء سے متاثرہ شاعری کے خذانے میں تشبیہات و استعارات کا کافی ذخیرہ موجود ہے۔

الغرض یہ کہا جا سکتا ہے کہ ہمارا یہ شعری سرمایہ وقتی اور ہنگامی موضوع کا غیر فن کارانہ اظہار نہیں بلکہ اپنی مقعدیت کے باوجود ہمارے ادبی و اجمالیاتی ذوق کی تسکین کا ذریعہ بھی ہے۔

ہئیتی اعتبار سے بھی اس شاعری میں بہت کچھ موجود ہے شہر آشوب کو مسدس کی شکل میں زیادہ تر پیش کیا گیا ہے۔

۱۸۵۷ء کی شاعری اپنے وقت اور حالات کی منہ بولتی تصویریں پیش کرتی ہے۔ اس دور کی شاعری میں نہ صرف شعری صداقت ملتی ہے بلکہ تاریخی صداقت بھی پیدا ہوگئی ہے۔

عرض اس دور کی شاعری میں تاریخ، مغلیہ حکومت کا زوال، حکمرانوں کی نااہلی، سیاسی ابتری، بادشاہ کی معزولی ۱۸۵۷ء کی لڑائی کا مفصل حال انگریزوں کا ظلم و ستم قتل عام لاشوں کی عبرت ناک حالتیں شہریوں کا در بدر بھٹکنا اہل ہنر اور باکمالوں کی بدحالی وغیرہ جیسے حالات ملتے ہیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ یہ شعری کارنامہ ادبی حیثیت کے ساتھ ساتھ تاریخی حیثیت کا بھی حامل ہے۔

شعراء مابعد میں جن شعراء کا کلام درج ہے وہ مندرجہ ذیل ہیں۔

شبیر حسن جوش، ساغر نظامی، غلام ربانی تاباں، جگناتھ آزاد، آنند نرائن ملا، راہی معصوم رضا، جگت موہن رواں، عرش ملیانی، تلوک چند محروم، سلام مچھلی شہری، اعجاز صدیقی، جمیل مظہری، محمود جالندھری، رفعت سروش، وقار واثقی، شمیم کرہانی، اقبال احمد سہیل، کمال احمد صدیقی، غلام احمد فرقت، یحیٰ اعظمی، احمق پھپھوندوی۔

۶ ادبی اہمیت:

۱۸۵۷ء کا ادبی سرمایہ کئی اعتبار سے اُردو ادب میں اہمیت کا حامل ہے۔ اس میں کچھ ایسی خصوصیات ملتی ہیں۔ جو اسے قدیم ادب سے ممیز و ممتاز کر کے فوقیت عطا کرتی ہے۔ انھیں ہم بجا طور پر جدید ادب کا نقطہ آغاز قرار دے سکتے ہیں۔ اس سے قبل کے ادب میں سماجی زندگی کو اتنے قریب سے نہیں دیکھا گیا تھا، بلکہ اُردو شاعری کا معتد بہ حصہ خیال آرائی اور مضمون آفرینی کا نتیجہ معلوم ہوتا ہے لیکن اس المیہ سے متاثر ہو کر ہر ذی الحس شاعر نے اپنے احساسات و جذبات کا اظہار کیا۔ اس سے قبل جاگیردارانہ نظام کے تحت ادب درباروں سے وابستہ ہو کر مخصوص طبقہ کے جذبات و احساس کا ترجمان ہو کر رہ گیا تھا۔ یہ ۱۸۵۷ء کا ادب ہی ہے اس نے اسے

جمہور کی آواز میں تبدیل کر کے عوامی زندگی سے قریب تر کر دیا۔ اُردو ادب میں اس سے قبل اس کی مثال نظر نہیں آتی اس کا مطلب یہ نہیں کہ شاعری کا رشتہ اس سے قبل مخصوص مادی محرکات اور مخصوص ثقافتی واقتصادی حالات سے منقطع ہو گیا تھا۔ لیکن یہ نقوش بہت ہلکے تھے اور پھر شعراء نے خارجیت سے زیادہ داخلیت کی طرف توجہ دی۔ ۱۸۵۷ء کو موضوع کلام بنانے والے شعراء کے پاس سماجی وسیاسی شعور کی بالیدگی کا احساس ملتا ہے اور بالیدگی کا یہ احساس انھیں انفرادی وداخلی موضوعات سے ہٹ کر خارجیت سے بھی رجوع کرنے پر مجبور کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ۱۸۵۷ء کے شعری ادب میں شعراء نے نہ صرف اپنی عصری زندگی کی ترجمانی کی بلکہ حقیقت نگاری کی بہترین مثالیں بھی پیش کی ہیں۔ ''قدیم شعراء نے جو شہر آشوب لکھے ہیں انمیں اپنے عہد کی تصویر کشی پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ کہیں کہیں تنقیدی نظر بھی ڈالی ہے''

(40, جاں نثار اختر، ۱۹۷۴ء)، ہمارا ہندوستان۔ ہندوستان بک ٹرسٹ بمبئی جلد ۲۴)

''۱۸۵۷ء کو موضوع کلام بنانے والے شعراء کے پاس سماجی وسیاسی شعور کی بالیدگی کا احساس ملتا ہے اور بالیدگی کا یہ احساس انھیں انفرادی وداخلی موضوعات سے ہٹ کر خارجیت سے بھی رجوع کرنے پر مجبور کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ۱۸۵۷ء کے شعری ادب میں شعراء نے نہ صرف اپنی عصری زندگی کی ترجمانی کی بلکہ حقیقت نگاری کی بہترین مثالیں بھی پیش کی ہیں۔ یہ حقیقت نگاری کی مندرجہ ذیل تعریف کا بڑی حد تک احاطہ کرتا ہے۔

(41, عزیز احمد ۱۹۷۰ء ترقی پسند ادب، چمن بک ڈپو دلی ص ۱۲)

''اس کا پہلا مقصد یہ ہے کہ زندگی کی نقاشی کرے وہ کچھ پوشیدہ نہیں رکھنا چاہتا کچھ نہیں چھپاتا نظریاتی طور پر وہ انتخاب یا تراش خراش کے اُصول کا پابند نہیں غیر متعلقہ تفصیلات کو البتہ کم کر سکتا ہے۔ اُس کا اندازِ بیان بہت صاف اور سیدھا ہوتا ہے۔ اس کا اسلوب اس کے موضوع سے پوری طرح مناسبت رکھتا ہے۔ واقعی زندگی سے وہ جتنا قریب ہو سکے وہ اتنا ہی بڑا حقیقت نگار ہے۔''

(42, عزیز احمد ۱۹۷۰ء ترقی پسند ادب، چمن بک ڈپو دلی ص ۱۲)

۱۸۵۷ء کے شعری ادب کا موضوع ایک ہنگامی اور وقتی موضوع ہے۔ اس میں تہذیب ومعاشرت، سیاست اور معاشی حالات کا بیان بھی ملتا ہے لیکن ان موضوعات کو شاعر نے خشک انداز میں پیش نہیں کیا بلکہ شاعری کے تقاضوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے اُس میں شعریت بھی پیدا کی لیکن ظاہر ہے شعراء اپنے جس اندرونی کرب کا بے محاسبہ اظہار کر رہے تھے اس میں وہ صنعت گری کو ہی شاعری کا متبادل قرار نہیں دے سکتے تھے۔ نعیم احمد کا یہ بیان جو شہر آشوب سے متعلق ہے پورے شعری سرمایہ پر صادق آتا ہے۔

'' اس میں صداقت، گیرائی گہرائی، سادگی اور پُر کاری ہونے کے باوجود ان فنی عناصر کی صرف اس حد تک آمیزش کی گئی ہے کہ ذہن جمالیات''

(43, جاں نثار اختر، ۱۹۷۴ء، ہمارا ہندوستان۔ ہندوستان بک ٹرسٹ بمبئی جلد ۲۴ ص ۷۲)